ڈاکٹر محمد اعجاز تبسم

اسسٹنٹ پروفیسر،

لاہور گیرژن یونیورسٹی، لاہور

اقبال اور بیسویں صدی کی شاعری

Abstract

In the Dehlavi era, the manifestations of Islamic civilization have appeared in a much more egalitarian manner than in the Deccan era. On the one hand, Shah Hatim became the spokesman of Irfan Nafs and Irfan Elahi. While in this era, the evocative forms of aesthetic sense in Mir's virtual color create enchantment by wearing Islamic cloak, the spiritual life under the shadow of Mir Dard's Islamic mysticism gave new freshness to Urdu ghazal. The formal Islamic consciousness of the deal is also visible. Ghalib's aesthetic immersion, full of spiritual pleasures, in which the narrative of the past and present of Islamic society and civilization is found, is manifesting itself with its full spirituality. It is also important for the believer to keep human needs in mind in his natural love. When Hasrat Dehlavi fought for the expression of religious traditions and values, Zauq devoted himself to adapting Islamic proverbs and Islamic historical facts to the cultural situation of his time, while Zafar's formal religious sanctity and social consciousness A new poetic universe emerges with a sense of the cultural aspects and universal cultural values of universal life.

Key Words: Manifestations, Shah Hatim, Aesthetic, Spirituality

مغلیہ سلطنت درحقیقت مسلم تہذیب و ثقافت کا ہی دوسرا روپ تھی جس میں اگرچہ ہندی عنصر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شامل ہوگیا تھا تاہم اس پر اسلامی فکر غالب رہی۔ مغلوں نے اپنے عہدِ سلطنت (۱۵۶۲ء تا ۱۸۵۷ء) میں بجاطور پر ایک باوقار تہذیب کی تربیت و پرداخت کی، ایک مستقلاً معاشرتی نظام، اخلاقی اقدار و روایات سے مملو تہذیبی رجحان کو جنم دیا جس کے فکری رجحانات اور رویے سراسر اسلامی تہذیب سے استفادے پر مبنی تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے سیاسی وسماجی

حالات نے بالخصوص اُردو غزل پر براہِ راست اپنے اثرات مرتسم کیے۔اس عہد کے عمومی تہذیبی و معاشرتی رویوں میں تغیر و تبدل رونما ہوا۔مغلیہ سلطنت جب زوال کی دہلیز پر کھڑی تھی تو عوام تنزلی کا شکار ہوئے۔مگر مغلیہ سلطنت کا یہ احسان کیا کم ہے بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم کہ مغلوں نے صرف اپنے دور میں حکومت نہیں کی بلکہ ایک تہذیب کی پرورش کی ہے۔[۱]

ولی کے معاصرین میں آزاد اور فراقی دکنی نے بھی فارسی سے عاشقانہ مضامین اخذ کیے اس اخذ و استفادے کا فایدہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری اب فارسی گوئی کے بالمقابل آکھڑی ہوئی اور اس قابل ہوگئ کہ فارسی سے آنکھیں چار کرسکے۔ولی کا دیوان جب محمد شاہی عہد میں دلی پہنچا تو بعض فارسی گو شعرا جن میں شاہ مبارک، نجم الدین آبرو، سراج الدین آرزو، شاکر ناجی، مضمون، یک رنگ اور احسن اللہ احسن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں یہ تمام بھی ولی کے تتبع میں اُردو شاعری کی طرف مائل ہوئے۔اسے ہی ہم دہلی/شمالی ہند میں اُردو شاعری کا مطلع اول قرار دے سکتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی[۲]، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی[۳]، رام بابو سکسینہ[۴]، ڈاکٹر عبدالسلام [۵]اور ڈاکٹر انور سدید[۶] کا بھی یہی خیال ہے کہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا ولی کے دیوان کے زیراثر عہد محمد شاہی میں ہوئی۔

دہلوی شعرائے غزل کے دواوین کی ابتدا بالترتیب حمدیہ غزل، نعتِ رسول مقبولؐ اور مناقب صحابہؓ و اولیائے کرام سے ہوتی ہے، کہیں اسلامی عقاید کا تذکرہ ہے تو کہیں اسلامی تہذیبی اقدار و روایات اپنا خاص رنگ جماتی نظر آتی ہے۔قرآنی تلمیحات، اسلامی تہذیب و تاریخ اور سماج سے ماخوذ تشبیہات، آیاتِ کریمہ اور حدیثِ نبویؐ بھی اس عہد میں اپنا ایک خاص گہرا تاثر قاری کے قلب و ذہن پر چھوڑتی ہیں۔ لہٰذا ہم دہلوی عہدِ غزل کو اُردو شاعری کا زریں عہد شمار کرسکتے ہیں جس میں ابتدا تا حال فکری و تہذیبی سطح پر بے مثل مضامین کا اضافہ ہوا۔اس دور کی غزل میں ہند اسلامی سماج کا مذہبی شعور نہ صرف سامنے آیا بلکہ اسلامیانِ ہند کا عہدِ ماضی اپنے تمام تر تزک و احتشام کے ساتھ اس کی زینت بنا۔اب ہم بالترتیب متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرائے دہلی میں سے چند اُردو غزل گو شعرا کا اسلامی تہذیب کی روشنی میں مطالعہ کریں گے۔

دبستانِ دہلی کا پہلا عہد متقدمین شعرائے دہلی (شاہ حاتم و آبرو) کے نام سے موسوم ہوا ہے۔ اس عہد کے نمایندہ شعرا میں شاہ حاتم، نجم الدین شاہ مبارک آبرو، فائز دہلوی، سراج الدین آرزو، شرف الدین مضمون، یک رنگ، شاکر ناجی اور مرزا مظہر جانِ جاناں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دور فارسی شعرا سے استفادے پر مبنی اور ایہام گوئی جیسی مقبولِ عام تحریک ادب اُردو سے پُررونق ہے۔دہلوی

شعرائے اُردو غزل نے اپنی ذومعنویت کے سبب اس عہد میں اسلامی تہذیب کے محاسن اور سماجی زندگی کے معائب و مسائل کو نیا رنگ دینے کی کوشش کی۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کے اس ابتدائی عہد میں فارسی مضامین کی بھرمار ہے، صرف فارسی کی دلآویز اور دل کش تراکیب ہی اس کی جان نہیں بلکہ اسلامی تہذیبی و فکری پس منظر، اسلامی تہذیب سے ماخوذ استعاروں، تشبیہوں، تلمیحات، اخلاق و تہذیبی اقدار و روایات نے اس عہد کو ایک خاص فکری شعور عطا کیا ہے۔ دراصل خسرو، حسن، عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب، بیدل، حافظ اور سعدی جیسے فارسی کے معروف شعرا سے اثر پذیر ہونے والا یہ عہد اُردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔اس عہد کو تہذیبی کروٹ دینے کا اعزاز ولی دکنی کو حاصل ہے۔ولی دہلوی والوں کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوئے۔بقول رام بابو سکسینہ:

> جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہوگئے۔آبرو، حاتم، ناجی، مضمون، مرزا مظہر جان جاناں کو جو ولی کے ہم عصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے۔ ریختہ کا آبائے قدیم سمجھنا چاہیے۔یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوشِ تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی۔ (۷)

درحقیقت اس عہد کے غزل گو شعرا کی ابتدائی تخلیقات دو بنیادی رجحانات کے زیر اثر وجود پذیر ہو رہی ہیں ایک طرف فارسی شاعری کا مذاق اہم ہے تو دوسری طرف ولی دکنی نے ان کے تخیل کو متاثر کیا ہے۔لہٰذا ان کے ہاں نشاطیہ آہنگ، ایہام گوئی اور متصوفانہ طرزِ فکر نے اپنی سحر آفرینی پیدا کی۔ ایہام گوئی اس عہد کی پہلی خصوصیت ہے تو رام بابو سکسینہ تصوّف کو اس زمانیکی دوسری خصوصیت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایک دوسری خصوصیت اس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا یہ رنگ اس زمانے میں عالم گیر تھا۔وجہ یہ تھی کہ شعرا اکثر صوفی مشرب ہوتے یا کم از کم آخر عمر میں ہو جایا کرتے تھے۔ پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی ہوتی تھی اور اُردو شاعری اس کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا جزوِ اعظم تھا۔انھیں اسباب سے اُردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصا چڑھ گیا۔(۸)

یہ رنگ آگے چل کر انتہائی مقبول ہوا اور متوسطین شعرائے دہلی میں خواجہ میر درد اور دیگر شعرا نے اس کو اپنا لیا۔

شاہ حاتم، شیخ ظہور الدین کی غزلیات میں بجا طور پر اسلامی تہذیب سے گہری وابستگی کا اظہار ملتا ہے۔اسلامی تہذیب نے ان کی فکری اور ذہنی جہت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اسلامی تہذیب و مذہب کے بنیادی عقاید میں عقیدہ توحید کے قائل ہیں۔ وہ اپنا ایک خاص متصوفانہ مزاج رکھتے ہیں۔ وہ خدائے بزرگ و برتر کو وحدہٗ لاشریک اور تمام کائنات میں (موجوداتِ کل) مخلوقات کا خالق و مالک متصور کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے ان کی روحانی وابستگی ان کے ''دیوان زادہ'' کی پہلی غزل اور دیگر اشعار سے عیاں ہوتی ہے۔ وہ جابجا اپنی غزلیات میں قرآنی الفاظ، احادیث اور صوفیا کے اقوال کو استعمال کرتے ہیں۔ اللہ کی قدرت کے مختلف مظاہر کائنات کے ذرے ذرے سے عیاں اور مجسم صورت میں موجود ہیں۔انھوں نے اپنی غزلیات میں اسلامی تصوف کے دو معروف نظریات وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا تذکرہ اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ کیا ہے۔

شیخ ظہور الدین حاتم کے فکری و تہذیبی اسلامی محرکات کی اصل ان کے مذہبی عقاید سے متعین ہوئی تھی۔ وہ اسلامی تصوف کے معروف سلسلے سہروردیہ سے بیعت تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور مذہبی شرعی احکامات یعنی تسبیح و مصلیٰ ان کی زندگی کا عکس بنا۔ وہ ہر دم اوراد و وظائف میں مشغول و منہمک رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں مکمل طور پر اسلامی تہذیبی پس منظر اُبھرتا نظر آتا ہے:

کیا کہے قاصر زباں توحید و حمد کبریا
جس نے کن کے حرف سے کونین کو پیدا کیا[۹]

نحن اقرب تو راست ہے لیکن
وہ ہے نزدیک تجھ سے تو ہے دور[۱۰]

نحن اقرب کی نہیں ہے رمز سے تُو آشنا
ورنہ وہ نزدیک ہے تو آپ اس سے دور ہے(۱۱)

کہیں خاک و کہیں باد و کہیں آب
کہیں وہ آتش سوزاں ہوا ہے(۱۲)

کہیں وہ صورت خوباں ہوا ہے
کہیں وہ عاشق حیراں ہوا ہے(۱۳)

عہد متوسطین کی اُردو غزل نہ صرف اپنی معاشرت اور سماجی حالات کی آہ و بقا کی آئینہ دار ہے بلکہ اس عہد کی تہذیبی و ثقافت اقدار کی امین بھی نظر آتی ہے۔ ہند اسلامی تہذیب کی آمیزش اور عشق کے حقیقی و مجازی رنگ نے مزید اسے چاند چاند لگا دیے ہیں۔ جس میں ہندستانی و ایرانی اور عربی عناصر کا ارتباط جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کرب و بلا کے غموں کا تاج محل ہندستانی سرزمین پر سجا اپنی داستانِ الم بیان کر رہا ہے۔

یہ عہدِ غزل گوئی اپنی تمام تر رعنائیوں، معاشرتی معیار و مسائل اور تہذیبی ناہمواریوں کو پیش کرنے میں بے مثل ہے۔ یہ اپنے اسلامی تہذیبی مزاج کی بدولت نہ صرف آفاقیت کا حامل رکھتا ہے بلکہ شاعری کی تاریخ میں موضوعاتی اور معیاراتی سطح پر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس میں میر تقی میر خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل قرار پائے۔ قصیدہ میں مرزا محمد رفیع سودا کو باوا آدم کا درجہ ملا۔ سحر البیان کے خالق میر حسن جیسے نامی گرامی شعرا اور دیگر سخنوروں نے اس کو کمال ترقی عطا کی۔ انھوں نے اپنے خاص تنقیدی شعور کی وساطت سے حقائق پر مبنی موضوعات کو اُردو غزل کا حصہ بنایا۔ معاشرتی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی سطح پر لا کر بھی اسے وہ وسعت عطا کی جو اسے اس سے پیشتر نصیب نہ ہو سکی تھی۔

میر اسلامی تہذیب و مذہب کے عقیدۂ آخرت کے بھی ایک مسلمان ہونے کے ناطے قائل ہیں۔ گو میرؔ نے اپنے مذہبی عقاید اور تہذیبی شعور کی بنا پر جابجا اپنے دواوین میں انسان کی کم وقعتی۔اپنے سماجی شعور، سوز و گداز، سادگی و پرکاری، دردمندی، خلوص و صداقت، اجمال و ایمائیت، سہل ممتنع اور خطابیہ انداز جیسی بے مثل خصوصیاتِ کلام رکھنے والے میرؔ جب اپنی وارداتِ قلبی کی

سچی ترجمانی اور زندگی کی اصل صداقتوں کو شعر کے پیرائے میں ڈھالتے ہیں تو یہ درحقیقت صرف ایک فرد کی زندگانی کا نوحہ نہیں بلکہ اسلامیانِ ہند کے شاندار ماضی اور مغلیہ عہد کی صحیح تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

میر دردؔ کی طرح تصوف میرؔ کا ذاتی تجربہ کبھی نہیں بنا مگر وہ مزاجاً صوفی اور درویش منش انسان تھے۔ ان کے کلیات میں متصوفانہ اصطلاحات، مذہبی اسلامی علامات، اخلاقی اقدار اور اسلامی تہذیب کی سماجی روایات کا مذکور دراصل ان کا دین اسلام سے بے پناہ لگاؤ اور مسلکِ تصوف سے لامتناہی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ:

> میر نے اپنے زمانے کی صوفیانہ قدروں کو اپنے سوزِ باطن میں تپا کر انھیں نئی شکل دی اور شاعرانہ احساس کی سطح پر مسلک عشق کے نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ یہ مذہب زندگی کے شخصی اور سماجی دونوں پہلوؤں کا رازداں ہے اور انتہائی خودداری اور شائستگی کے ساتھ اپنے زمانے کے درد و کرب اور حزن و اضطراب کا متحمل بنتا ہے۔"(۱۴)

میرؔ کی غزل مجموعی طور پر اسلامی تصوف کی امین اور ان کے ذاتی مذہبی شعور کی آئینہ دار دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزل میں ان کے مذہبی رویے اور تہذیبی میلانات ان کے مجموعی اسلامی تاثر اور ذوق کو اُبھارتے ہیں، جس سے ہمیں اُردو غزل کا مجموعی رویہ جیسے الفت، رواداری، مساوات، اخلاص کی رو، قربانی کا جوش، وسیع النظری، عالی ظرفی، فراخ حوصلگی، راست بازی، حریتِ فکر، انسان دوستی اور اپنی تہذیبی و اخلاقی روایات و اقدار کی رگوں میں خون تازہ کی حدت کا احساس ہوتا ہے۔

میرؔ نے اپنی متصوفانہ طرزِ فکر اور اسلامی تہذیب سے استفادے پر مبنی حیات کو شعوری و لاشعوری طور پر دینِ اسلام کے زریں اصولوں میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم:

> میرؔ کے مذہبی رویے اور تہذیبی میلانات کے مجموعی خدوخال، اخوت، محبت، رواداری، مساوات، اخلاص، وسیع المشربی اور آزادہ روی، انسان دوستی پر مشتمل ہیں اور نمود و نمایش سے گریز کے حامی ہیں۔یہ صفات اسلامی تصوف میں میر کو یکجا نظر آتی ہیں۔ (۱۵)

خواجہ میر دردؔ کا غزلیہ کلام بڑا پُرتاثیر اور بصیرت افروز ہے جس میں حیات خیزی بھی ہے، متصوفانہ واردات بھی اور ایک زندہ دل عاشق کی تڑپ بھی جو انھیں اپنے عہد کے دیگر شعرا سے زیادہ باہمت، عالی حوصلہ اور عالی ظرف ثابت کرتا ہے۔اسلامی تصوف نے ہی ان کی زندگی کو یکسر

بدل دیا تھا بلکہ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں کہیے: ’’تصوف نے انھیں سادگی، جذباتی شدت، پاکیزہ خیالی اور شان خودداری عطا کی تھی اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔‘‘(۱۶)

وہ حقیقتِ الٰہیہ کا ادراکِ اسلام کے بعض مستند تاریخی حوالہ جات اور تہذیبی رویوں کے توسط سے کرتے ہیں وہ حضرت خضرؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ، محمدؐ، سلیمانؑ، ابراہیمؑ کو تلمیحی اشاروں کے ذریعے سے موضوع سخن بناتے ہیں۔رب کائنات کی اصلی حقیقت، خضرؑ و موسیٰؑ (سورۃ الکھف، آیات۶۰تا۸۲) کے اسفار کا تذکرہ ہند اسلامی تہذیبی روایت کے پس منظر میں کرتے ہیں۔

حقیقتِ روح، عالم تمثال، وجودِ باری تعالیٰ، کائنات کی اصل حقیقت، کائنات کا قدم و حادث ہونا، جبر و قدر، جبر و اختیار، خیر و شر، وجود و عدم، فنا و بقا، وجود و شہود، جزو وکل، تخلیقِ کائنات کے مقاصد، زیست انسانی کی صحیح حقیقت، آدمیت کا مفہوم، احترامِ آدمیت، حقوقِ الٰہی، حقوق العباد، عشق خدا اور رسول، وارداتِ دل، نالۂ درد، سوز و گداز، عشقِ الٰہی، کائنات کی بے ثباتی وغیرہ یہ ایسے موضوعات ہیں جو ان سے پہلے کسی شاعر کے یہاں اجتماعی شکل میں نہیں ملتے البتہ شاہ تراب علی دکنی، سراج دکنی دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ان میں سے بیشتر موضوعات کو چھیڑا ہے مگر اس پر مکمل گرفت انھی کی تھی۔بقول خلیل الرحمٰن داؤدی:

> اخلاقی مسائل، حقائق و معارف، وارداتِ عشق اور انسانی فطرت کے رموز جس طرح میر درد نے اُردو شاعری میں سمجھائے ہیں اور کسی کو یہ سعادت نصیب نہ ہوسکی۔(۱۷)

وہ معرفتِ ذات اور معرفتِ حق کو اپنی وارداتِ قلبی کے ذریعے سے موضوع سخن بناتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے حقائق و معارف اور اخلاقی مسائل کو انھوں نے جذبہ و عمل کے حسین امتزاج سے واضح کیا ہے۔چوں کہ وہ ایک باعمل اور بااخلاق صوفی تھے اس لیے ان کا کلام بھی ان کی تجرباتی زندگی کا نچوڑ ہے۔ڈاکٹر اقتدا حسن نے کلیاتِ قائم کے مقدمہ میں صفحہ۱۳ پر خواجہ میر درد کو ایک صوفی باعمل اور درویش صفت انسان شمار کیا ہے: ’’درد ایک صوفی باعمل اور درویش صفت انسان تھے۔‘‘(۱۸)

تصوف دردؔ کے لیے محض ایک رجحان یا رویہ نہیں ہے بلکہ ایک باعمل طرزِ زندگی اور تہذیبی و اسلامی مذہبی روایت سے عبارت ہے۔ وہ اُردو غزل میں صوفیانہ طرزِ فکر کے پہلے باقاعدہ باعمل صوفی شاعر ہیں۔اگرچہ ان سے پہلے بھی اسلامی تصوف کے رموز و مسائل مثنویات، ولی کی غزلیات اور دیگر شعرا کے یہاں مل جاتے ہیں لیکن میر دردؔ صرف شاعرانہ رنگ میں ہی متصوفانہ خیالات کو

نہیں رنگا بلکہ انھوں نے عملی طور پر اس کی تقلید بھی کی۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: ’’وہ ایک بڑے شاعر اور ایسے باکمال صوفی، عالم اور فقیہہ تھے کہ جس نے شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت کے مدارج طے کیے تھے۔‘‘(۱۹)

المختصر دہلوی عہدِ غزل میں اسلامی تہذیب کے مظاہر دکنی اُردو غزل کی بہ نسبت کہیں زیادہ اپنی مساویانہ یکسوئی کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ایک طرف شاہ حاتم عرفانِ نفس اور عرفانِ الٰہی کے ترجمان بنے تو دوسری طرف مضمون، یک رنگ، شاکر ناجی، آرزو اور آبرو نے اپنے عہد کی مادی کثافتوں اور اسلامی زندگی کی لطافتوں کو موضوعِ سخن بنایا۔جہاں اس عہد میں میر کے مجازی رنگ میں جمالیاتی احساس کی ارتقاعی صورتیں اسلامی لبادہ اوڑھ کر سحر خیزی پیدا کرتی ہیں وہاں میر درد کی اسلامی تصوف کے زیر سایہ روحانی حیات نے اُردو غزل کو نئی تازگی بخشی۔علاوہ ازیں میر حسن اور سودا کا باضابطہ اسلامی شعور بھی دید کے قابل ہے۔

اس عہد کی غزل میں غالب کا حکیمانہ و فلسفیانہ انداز، ذوق کی محاورہ بندی، شاہ نصیر کی ترش اور چاک و چوبند بندشیں اور فارسی تراکیب، ظفر کی موسیقیت اور مومن کا رنگ تغزل اور معاملہ بندی ایک وجدانی فضا پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ مومن کی ندرت، جدت پسندی، معاملہ بندی، محاکات نگاری اور ابہام جیسے مناقب سے لبریز غزل اپنے عہد اسلامی کی لامثالی تصاویر سامنے لاتی ہے۔ان کی غزل مضامین عالی سے متصف ہے۔ تشبیہات و استعارات اور تلمیحات میں ظفر، شاہ نصیر، ظہیر دہلوی اور مجروح نے اسلامی تہذیب کی اخلاقی اقدار اور روایات کو مجروح نہیں کیا بلکہ اسلامی تہذیبی پس منظر میں وہ سبق آموز اضافے کا سبب قرار دیے جاسکتے ہیں۔

آتش آہ بے اثر سے مری
آسمان گلشن خلیل ہوا
آسمان راہ پر نہیں آتا
دعویٰ خصر بے دلیل ہوا
کس قدر تیز رو ہے سوئے صنم
نامہ بر میرا جبریل ہوا(۲۰)

غالب کا روحانی لطافتوں سے بھرپور جمالیاتی استغراق اپنا ایک خاص تہذیبی تاثر رکھتا ہے۔اس میں اسلامی سماج و تمدن کے عہدِ ماضی و حال کی داستان رقم ملتی ہے ان کا کلام اپنے ایک خاص تہذیبی و فکری پس منظر میں اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ اپنی جلوہ گری دکھا رہا ہے۔اس عہد میں مومن کا فطری عشق میں انسانی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا بھی معنی خیز ہے۔ حسرت دہلوی نے مذہبی روایات و اقدار کے بیان میں اپنی جان لڑا دی تو ذوق نے اُردو محاورات اور اسلامی تاریخی حقائق کو اپنے عہد کی تمدنی صورتِ حال کے مطابق ڈھالنے کی لگن کی، ظفر کا باضابطہ مذہبی تقدس اور سماجی شعور جب جمالیاتی احساس کے پردے میں ہمہ گیر زندگی کے تہذیبی پہلوؤں اور مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار کا احساس لے کر جلوہ گر ہوتا ہے تو اک نئی روحانی شعری کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔

ذوق نے ہند اسلامی تہذیب کے ارضیت کے مزاج کو اپنی غزل کا غالب حصہ قرار دیا ہے۔ذوقؔ کہیں حسن ارضی کے تصور سے بالاتر ہو کر لامکاں کی حدود کو چھوتے نظر آتے ہیں وہ اس کو جمالیاتی رنگ میں کہیں حقیقت و مجاز، کہیں تجرید و تجسیم، کہیں طبیعیاتی و مابعد الطبیعیاتی تو کہیں تخصیص و تعمیم کی وساطت سے اس کی امتیازی صورت کو اُبھارتے ہیں۔ان کی غزل میں عربی و فارسی کی قدیم تہذیبی و سماجی اقدار کی بو باس بھی بسی ہوئی ہے اور ہندستانی تہذیب کی خوشبو بھی۔ذوق نے اپنے جمالیاتی شعور کے پیش نظر غزل میں الٰہیات کے ضمن میں تصعید و ارتفاع کی اعلیٰ ترین صورت اور حقیقتِ مطلق کا منفرد تصور دیا ہے۔ان کے ہاں کہیں مجاز سے حقیقت تو کہیں حقیقت سے مجاز کی جانب بڑھنے کی صورت بھی بڑی دلچسپ ہے۔

ذوق کی اسلامی تہذیبی پس منظر میں یہ جمالیاتی رنگ اُردو غزل کا خالصتاً روایتی و تہذیبی رنگ ہے جس کا ذکر ان سے پہلے دکنی عہد، دہلوی اور لکھنوی عہدِ غزل کی زینت رہا ہے۔

ذوق کے یہاں غزل میں اسلامی تہذیبی ومذہبی پس منظر بدرجہ اتم موجود رہتا ہے اگر وہ محبوب کے رخسار کو مصحف اور قرآن کہہ رہے ہیں تو اس سے ایک خاص طرح کا مذہبی تقدس ذہن میں اُبھرتا ہے۔ان کے ہاں ایسے اشعار جن میں اسلامی تہذیبی پس منظر اپنے جمالیاتی صورت میں نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔

دیکھ سکتا جو تجلی رخ جاناں کو
لن ترانی کا سزاوار نہ موسیٰؑ ہوتا[۳۱]

ان کے کلام کی سادگی و پرکاری قاری کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔آپ راسخ العقیدہ مسلمان، درویش صفت، منکسرالمزاج اور انتہائی متوکل انسان تھے۔انبیائؑ، صحابہ کرامؓ، آلِ رسولؐ اور آئمہ آلِ محمدؐ سے آپ کو خاص انس تھا جو آپ کے قصاید اور غزلیات میں جابجا نظر آتا ہے۔ان کے یہاں حسن اولیت کے زمرے میں اور عشق ثانوی درجے پر فائز ہے۔فنا میں بقا کا راز مضمر ہے۔ان کی تمام غزل انسانی عظمت کی دلیل ہے۔بقول سعداللہ کلیم: ”اُردو غزل کا اس موضوع پر مجموعی رویہ یہ رہا ہے کہ انسان بلاشبہ حفظ مراتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے عظیم ہی نہیں بہت عظیم ہے۔“[۲۲]

اُردو غزل کا مجموعی رویہ انسان کی عظمت، احساس ذمہ داری اور تمام مخلوقاتِ خدا پر برتری رکھنے کے حوالے سے ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ذوق کے یہاں عظمت بشری کا یہ تصور قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔وہ نیابتِ الٰہی کے قائل ہیں قرآن میں بھی انسان کو اللہ کا نائب اور خلیفہ متصور کیا گیا ہے۔

نہیں بے وقر ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم
عدو کی سرکشی سے ذوق کب رتبہ ہو کم میرا[۲۳]

ملک سجدہ کریں آدم کو کیا بندہ نوازی ہے
دیا بندے کو اپنے اس نے خود آداب اپنا سا[۲۴]

واں طائر خیال اڑے تھا مرا جہاں
پرواز عاجزی میں پر جبرئیلؑ تھا[۲۵]

غالب کی غزل ہندستانی ذہن کے جمالیاتی تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتی ہے بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرکے ہندی و ایرانیت کی علم بردار ٹھہرتی ہے۔ غالب انسانی نفسیات کا نبض شناس شاعر ہے۔نئے تہذیبی اور سماجی حالات کے پیش نظر نہ صرف انھوں نے نئے تصورات کے ذریعے سے اُردو غزل کا دامن وسیع کیا بلکہ اسلامی تہذیبی روایات کا احترام اور اس سے حد درجہ لگاؤ کو بھی اپنے یہاں ظاہر کیا۔غالب انسانی نفسیات کے غماز اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے نکتہ داں ہیں۔انھوں نے ماضی کی روایات اور جدید عہدِ اسلامی کے ساتھ کماحقہ، انصاف کیا ہے۔غالب کی غزل اپنے عہد کا شفاف اور باتصویر آئینہ ہے۔جس میں متزلزل مشرقی تہذیب (مشترکہ ہند اسلامی تہذیب) کے مٹنے

اور شکست و ریخت سے دو چار ہونے کا دکھ بھی ہے اور جدید تہذیب کی متفرح صورت بھی۔ان کی غزل ادراکِ خودی، انسانی عظمت کی نغمہ خواں، زمانے کی نباض اور اسلامی تہذیب کی علمبردار ہے جو دلآویز و دلنشین بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

غالب کی غزل میں اسلامی فکرِ حیات کی روشنی میں ہجر و وصال کی پُرکیف ساعتیں جہاں اپنا رنگ جماتی ہیں وہاں پاکدامانی کا خیال بھی اپنے عروج کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔وہ اپنے کلام میں اسلامی تہذیب سے استفادے پر مبنی اخلاقی اقدار و روایات اور سماجی طرزِ حیات کو بڑے معنی خیز انداز میں واضح کرتے ہیں۔ان کے ہر ہر شعر میں اسلامی معاشرت کی پردہ داری اور عصمت کی خوشبو بسی ہے۔اس بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> ان کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں۔سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ ان کی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے ان کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے ہیں جن کی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔[۲۶]

الغرض انسانی فطرت کے گہرے مشاہدے، اس کے احساسِ تفکر، متنوع خصوصیات، بلند آہنگی، عجز و نیاز، مساوات، رواداری، ہجر کی الم سامانیاں اور صبر کی لذتیں جب اسلامی تہذیبی فکر کی ذیل میں ان کی غزل کا حصہ بنتی ہیں تو قدیم شعرا پر ان کی عظمت کی دھاک بیٹھ جاتی ہے:

نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہ کنعاں پر
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر[۲۷]

غالب نے اُردو غزل کو اسلامی تہذیبی افکار کی مساعی جمیلہ سے ہم کنار کیا ہے۔وہ اسلام کے زمانۂ ماضی کی تاریخ پر اپنے فکری شعور کی عمارت استوار کرتے ہیں۔وہ حیات بعد الموت پر شاکی نہیں بلکہ انسان کے اس ابدی سلسلۂ حیات کو بالخصوص موت کو غم و آلائم سے نجات کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ایسے تلخ اور سنجیدہ مضامین کے بیان میں وہ انتہائی فصیح و بلیغ انداز اپناتے ہیں۔غالب ایک باشعور اور باصلاحیت فرد کا نام ہے جس نے اپنے عہد کے مذہبی و سماجی مناقشات کو اسلامی تاریخی پس منظر میں سمو کر اک نیا شعور عطا کیا ہے۔وہ زمانے کے معائب و مسائل پر اشک بار ہوتا اور اپنے ماضی

سے بے پناہ شغف رکھتا ہے اس کی آنکھیں ماضی اور مستقبل کی جانب یکساں کھلی ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کے نمایندہ کی حیثیت سے ہمیشہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنے رہیں گے۔انھوں نے اسلامی تہذیب کو طعن و تشنیع اور ظرافت کے پردے میں لپیٹ کر اس کے تاریخی پہلوؤں کو ایک مبصر اور پُرخلوص نقاد کی طرح پیش کیا ہے جس میں ماضی و حال کی تمام تر وارداتِ حسن و عشق و سماج موجود ہے۔ڈاکٹر انور سدید غالب کو ایک عظیم الشان تہذیب کا نمایندہ اور نابغۂ فن قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:"غالب اپنے عہد کا نابغۂ فن تھا جس کے اجتماعی تجربے میں ماضی اور حال کی تمام واردات سما گئی تھی۔"(۲۸)

عیسیٰ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف
درد آفریں ہے طبع الم خیز یک طرف(۲۹)

پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی
ہم کو جلدی ہے مگر تو نے قیامت ڈھیل کی(۳۰)

سچ تو یہ ہے کہ اسلامی طرزِ حیات کی چھوٹی چھوٹی رنجشیں، ہجر و فراق کے لمحات، محبت کا بنیادی فطری رویہ، ضبط و اعتدال اور تہذیب و شائستگی کے تمام پہلو، حیات و کائنات کے وسیع تر مسائل اور انسانی حیات کے انوکھے تجربے ان کی غزل کا حصہ بنتے ہیں جس میں ان کا تہذیبی پس منظر بھی موجود رہتا ہے اور فکری میلان بھی۔غالب کی غزلیات (دیوان) میں اسلامی و آفاقی اقدار کا تذکرہ جابجا نظر آتا ہے۔وہ بعض دفعہ قرآن و حدیث کی مدد سے اشعار کو معنوی جہت عطا کر دیتے ہیں۔ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے مگر ایک غزل خاص طور پر سراسر اخلاقیانہ شعور کی پرستار ہے ڈاکٹر سعد اللہ کلیم اس ضمن میں لکھتے ہیں: "غالب کے اُردو دیوان میں ایک پوری غزل صرف اخلاقی اقدار پر مبنی ہے۔"(۳۱)

اس غزل میں غالب نے اسلامی اخلاقی تہذیبی اقدار کو بڑی لطافت اور نہایت سلیقہ مندی سے موضوعِ سخن بنایا ہے۔حاجت روائی، دھوکہ دہی، معاف کرنا، ضبط نفس، پردہ ڈالنا جیسی مثبت قدریں اس کا حصہ ہیں۔غزل کے چند اشعار دیکھیے:

ابن مریمؑ ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو، گر بُرا کہے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی
کیا کیا خضرؑ نے سکندر سے
اب کسے رہ نما کرے کوئی
روک لو غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی(۳۲)

غالب تاریخ کے جھروکوں سے چھن چھن کر آنے والی اسلامی تہذیب و روایات اور اخلاقی اقدار کی روشنی کو اپنے دامانِ خیال میں کچھ اس اچھوتے اور ظریفانہ انداز میں جگہ دیتے ہیں کہ کہیں ماضی کی اہمیت تو کہیں حال کی لگن نمایاں ہوتی نظر آتی ہے:

بہرِ جاں پروردنِ یعقوب بالِ خاک سے
وام لیتے ہیں پرِ پروازِ پیراہن کی بو(۳۳)

غرورِ دستِ رد نے شانہ توڑا فرقِ ہُدہُد پر
سلیمانی ہے ننگِ بے دماغانِ خود آرائی(۳۴)

کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوبؑ نے آنکھیں سفید
ہے جو آبی پیرہن ہر موج رودِ نیل کی(۳۵)

ظفر دہلوی کا کمال یہ ہے کہ بعض مادی و غیر مادی اشیا کو اسلامی مذہبی خانۂ تخیل میں ڈھال کر دل آویز پیکروں کو تشکیل دیتے ہیں۔ ظفر دہلوی کی غزلیات کا تشبیہاتی رنگ مکمل طور پر اسلامی تہذیب ومذہب سے مستعار ہے۔ انھوں نے اسلامی تہذیب سے دل آویز اور پُر کشش تشبیہات کو اخذ کیا ہے۔ وہ بعض جمالیاتی استعارےبھی تراشتے ہیں:

یہ جو ہے روئے کتابی یار کا قرآن ہے
خط جو ہے گرد اسکے یہ تفسیر اسکا نام ہے(۳۶)

سے شق القمر کہتے ہیں اون میں ایک ہے ادنی
کہ جو اعجاز اوس محبوب رب خیر الورا کے ہیں(۳۷)

جا کے کیا کعبہ میں چومیں حجر الاسود کو
اے ظفر سنگِ دریا یار کو ہم چومتے ہیں(۳۸)

ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کا ہے کیا کہنا
ظفر ہم خاک پا ان چار یارِ مصطفیٰؐ کے ہیں(۳۹)

بے ادب زلف ہے کیا روے مخطط پہ ترے
کہ لگاتی ہے یہ قرآن کو تفسیر کو پاؤں(۴۰)

جب ہم ان کی اس حمدیہ غزل میں کعبہ، صاحبِ خانہ، مسلماں، سیپارہ قرآں، نبیؐ، رحمۃ للعالمین، زلیخا، ماہ کنعاں اور باغ رضواں جیسے اسلامی تاریخ و مذہب سے مستعار تراکیب و الفاظ کو ان کے مذہبی شعور میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یقیناً ایک عالمگیر اور آفاقی معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ان کی یہ غزل حمدیہ و نعتیہ موضوع لیے ہوئے اسلامی تاریخ کے کئی روشن پہلوؤں کو بھی سامنے لاتی ہے۔ وہ اسلامی سماج کے قدیم دفینوں، تاریخی روایات اور ثقافتی لاشعور کے بحر ذخار سے نئے سنگریزے تراش کر کے فکر و عمل کی نئی راہیں دریافت کرتے نظر آتے ہیں۔

وہی کعبہ کا صاحب خانہ وہی دیر کا مالک
وہی رازق ہے کافر کا وہی ہادی مسلماں کا
اگر ہو جائے پارہ پارہ دل اسکی محبت میں
تو پھر ہر پارۂ دل کو سمجھ سیپارہ قرآں کا
نکرتا وہ اگر پیدا نبیؐ کو نوع انساں میں
تو مخلوقات میں اشرف نہوتا رتبہ انساں کا

نبی وہ رحمۃ للعالمین جس کی شفاعت سے
نہووے عاصیوں کو حشر کے دن خوف عصیاں کا
زلیخا دیکھتی گر اس نظر اس کا رُخ روشن
تو اسکو خواب ہو جاتا تماشا ماہ کنعاں کا
ظفر مضمونِ حمد و نعت کے گلہاءِ رنگیں سے
ورق میرے سرِ دیواں کا ہے اک باغ رضواں کا(۴۱)

ظفر دہلوی نے اپنی غزل میں اسلامی تہذیب کے یادگار ماضی اور اسلامی تاریخ و مذہب کے شہرہ آفاق قصص کو سمو کر بڑی دیدہ ریزی اور اعلیٰ فکری شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔بالخصوص ان کے ہاں متصوفانہ رنگِ تغزل اسلامی مذہب سے اپنائیت کا بہترین ثبوت فراہم کرتا ہے۔علاوہ ازیں وہ اپنے کلام میں عقاید اسلام، اصحابِ رسولؐ، اہل بیت اور صوفیا و اتقیا کا تذکرہ اس قلبی ذوق اور انہماک کے ساتھ کرتے ہیں کہ نہ صرف ایک راسخ العقیدہ مسلمان کا تاثر قاری کے ذہن میں اُبھرتا ہے بلکہ وہ ایک صوفی شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔بقول ڈاکٹر اسرار احمد خاں:

> ظفر کی صوفیانہ شاعری میں عقیدہ اور مسلک کے لحاظ سے ایک خاص ربط اور تسلسل ہے وہ توحید، رسالت، صحابہ کرام، اہل بیت اور بزرگانِ دین سے اپنی عقیدت اور مسلک کے اظہار میں انھوں نے کسی دنیاوی مصلحت سے کام نہیں لیا ہے وہ صحابہ کرامؓ اور اہل بیت کی عزت و تکریم ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے لے کر اپنے اوپر فرض سمجھتے ہیں۔وہ چاروں خلفائے راشدین کی ترتیب وار حقانیت اور ان کی بزرگی اور عظمت کے قائل تھے اور اُن کو نبی پاک کے یارانِ باوفا گردانتے تھے۔(۴۲)

پاکیزگی کا عنصر ان کی غزل کا غالب حصہ قرار دینا چاہیے جہاں ان کے کلام میں پند و موعظت، معاشرتی، معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کا بیان ملتا ہے وہاں انھوں نے ایک مخلص اور باوفا محبِ وطن کی طرح نہ صرف سرزمین ہند کو ٹوٹ کر چاہا ہے بلکہ پاکیزہ خیالات کی ترجمانی بھی کی ہے۔وہ یقینا ایک سچے اور کھرے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ان کا تمام کلام ان کی ذاتی زندگانی کا عکس معلوم ہوتا ہے۔وہ کشادہ سیرت، وسیع النظر، درویش صفت شاعر، عوام و خواص کے محبوب اور انتہائی صابر انسان تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے دوران اپنے عزیز و اقارب کی ناگہانی موت کو

بسر و چشم دیکھا اور خود کسمپرسی کی حالت میں مقید ہو کر رنگون میں انتقال کیا۔ ہندستانی تاریخ ان کی اس المناک موت کی شاہد ہے :

> اس کشادہ وسیع النظر بادشاہ مرتبت اور درویش مزاج انسان کا جو انجام ہوا وہ برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا شاید سب سے زیادہ المیہ باب ہے جس طرح ۱۸۵۷ء میں اس نے اپنے بیٹے، پوتے، عزیز، رشتہ دار، قتل ہوتے، گرفتار ہوتے دیکھے۔ جس طرح خود اس کو گرفتار کرکے رنگون میں قید رکھا گیا۔ وہاں اس پر جو جو ذہنی اذیتیں گذرتی رہیں اور جس حالت میں یہ دہلی کے عوام و خواص کا محبوب اور مربی انسان غریب الوطنی کی موت مرا یہ سب کچھ انتہائی المناک تاریخ ہے۔ اور اس کا عکس اس کی غزل میں پہچانا جاسکتا ہے۔ [۴۳]

ترے محراب دو ابرو کو کوئی کیا سمجھے
سمجھے کعبہ اُسے یا مسجدِ اقصیٰ سمجھے [۴۴]

دیکھ لے شب کو اگر خواب میں تیری صورت
ہو زلیخا کو نہ اتنا مہِ کنعان عزیز [۴۵]

ظفرؔ کی غزلیات میں صفحۂ قرآن، فردوسِ بریں، جدول، مصحف، عالم تمثال، محراب، کعبہ، یکتائیت اور محو حیرت جیسے اشارے اور قرینے جو اسلامی تہذیب کے مذہبی شعور کے آئینہ دار ہیں ان کے یہاں جمالیاتی رنگ میں ایک تقدس و ارفعیت کی فضا قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ حُسن مجازی کی صفات کو تصورِ حقیقت سے مختلط کرکے حُسن ظاہری کے خارجی اوصاف کی حدود کو پار کرکے تجسیم سے تجرید اور مجاز سے حقیقت کی مختلف جہتیں تلاش کرتے ہیں:

> مجاز تو کھلی آنکھوں کا تماشا ہے اور حقیقت بند آنکھوں کی سیر گاہ۔ مبارک ہیں جو کھلی آنکھوں سے حقیقت کی سیر کریں۔ تصوف کے رموز و نکات تو پیچیدہ ہیں "ہمہ اوست اور ہمہ از اوست" وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے شگوفے ظفر کے چمنستانِ فکر میں پھول بن کر کھل اٹھتے ہیں۔ مخلوق کی چاہت کی بجائے خالق کو پانے کی آرزو اُبھرتی ہے۔ [۴۶]

ظفر کا جمالیاتی شعور ان کی غزلیات میں مجاز و حقیقت کے امتزاجی قرینے سے متعین ہوتا ہے جس کی جڑیں وحدت الوجودی صوفیانہ نظریے میں پیوست نظر آتی ہیں۔ وہ ارفع روحانیت سے بھرپور جمالیاتی شعور سے متصف تھے جس میں حقیقی وجدان کا پرتو ملتا ہے۔جب وہ دیر و حرم، مجاز و حقیقت، کعبہ و محراب، منبر و مسجد اور میکدہ و کلیسا جیسی علامات لاتے ہیں تو قدرتی طور پر قاری کا ذہن اپنے گرد نور کا ہالہ سا تن لیتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سعد اللہ کلیم،ڈاکٹر: اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، جلد اول، ص۲۸۳۔

۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر: تاریخ ادب اُردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع پنجم، ۲۰۰۵ء، جلد دوم، ص۲۶۔

۳۔)۱ (نور الحسن ہاشمی،سید: ”ولی کی شاعری اور اس کا اثر“، مضمون مشمولہ محمد خان اشرف، ڈاکٹر: ولی: تحقیق و تنقیدی مطالعہ، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص۱۷۶۔ (۲) نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر: دہلی کا دبستانِ شاعری، دہلی: انجمن ترقی اُردو ہند، اشاعت ۲۰۰۶ء، ص۳۶، ۳۷۔

۴۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اُردو، مترجم مرزا محمد عسکری، لاہور: علمی بک ہاؤس، ۱۹۸۴ء، ص۵۸۔

۵۔ عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر: شعر الہند، اعظم گڑھ: معارف، مطبوع گردید، حصہ دوم، ص۲۸۔

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۸ء، ص۱۳۷۔

۷۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اُردو، مترجم مرزا محمد عسکری، لاہور: علمی بک ہاؤس، ۱۹۸۴ء، ص۵۸۔

۸۔ ایضاً، ص۵۹۔

۹۔ حاتم، ظہور الدین، شیخ: دیوان زادہ، مقدمہ و تدوین تحشیہ و تعلیقات از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: خیابانِ ادب، مارچ ۱۹۷۵ء، ص۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۱۱۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص۳۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص۳۴۔

۱۴۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، ۲۰۰۲ء، ص۱۶۲۔

۱۵۔ سعد اللہ کلیم،ڈاکٹر: اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، جلد اول، ص۳۸۲۔

۱۶۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر: غزل اُردو کی شعری روایت، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص۴۰۔

۱۷۔ درد، خواجہ میر: دیوانِ درد، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص۸۹۔

۱۸۔ قائم: کلیاتِ قائم، ''مقدمہ''، مرتبہ اقتدا حسین، لاہور: مجلس ترقی ادب، سنہ اشاعت ندارد، جلد اول، ص۱۳۔

۱۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر: تاریخ ادب اُردو، مجلس ترقی ادب، لاہور،۲۰۰۵ء/طبع پنجم، جلد دوم، ص۳۰۷۔

۲۰۔ مومن، مومن خان: کلیاتِ مومن، مرتبہ کلب علی خاں، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم ۲۰۰۸ء، ص۸۲۔

۲۱۔ ذوق، محمد ابراہیم: کلیاتِ ذوق، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت دوم، حصہ اول، ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء، ص۱۴۵۔

۲۲۔ سعد اللہ کلیم،ڈاکٹر: اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، جلد اول، ص٦٦٦۔

۲۳۔ ذوق، محمد ابراہیم: کلیاتِ ذوق، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت دوم، حصہ اول، ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء، ص۱۲۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۵۱۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۴۹۔

۲۶۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اُردو، مترجم مرزا محمد عسکری، لاہور: علمی بک ہاؤس، ۱۹۸۴ء، ص۲۴۹۔

۲۷۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں: دیوان غالب، مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۱۹۶۹ء، ص۱۰۵۔

۲۸۔ انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع سوم، ۱۹۹۸ء، ص۳۹۸۔

۲۹۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں: دیوان غالب، مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۱۲٦۔

۳۰۔ ایضاً، ص۱۸۳۔

۳۱۔ سعد اللہ کلیم،ڈاکٹر: اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، جلد اول، ص۲۰۷۔

۳۲۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، دیوانِ غالب، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء، ص۱۸۳۔

۳۳۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں: دیوان غالب، مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۱۹۶۹ء، ص۱٦۹۔

۳۴۔ ایضاً، ۱۸۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۱۸۳۔

۳۶۔ ظفر، ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ: کلیاتِ ظفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، جلد چہارم، ص۴۵۲۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۹۴۔

۳۸۔ ایضاً، ص۳۸۷۔

۳۹۔ ایضاً، ص۳۹۴۔

۴۰۔ ایضاً، ص۴۰۳۔

۴۱۔ ظفر، ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ: کلیاتِ ظفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، جلد سوم، ص۵۔

۴۲۔ اسرار احمد خاں، ڈاکٹر: بہادر شاہ ظفر: شخصیت و فن، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص۲۳۳۔

۴۳۔ سعد اللہ کلیم،ڈاکٹر: اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، جلد اول، ص۶۲۹۔

۴۴۔ ظفر، ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ: کلیاتِ ظفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، جلد سوم، ص۱۷۰۔

۴۵۔ ایضاً، جلد سوم، ص۴۳۳۔

۴۶۔ اسرار احمد خاں، ڈاکٹر: بہادر شاہ ظفر: شخصیت و فن، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص۲۲۶۔